اورنگ زیب نیازی*

وبا: حقائق اور فکشن (کورونائی عہد میں لکھے گئے اردو فکشن کا خصوصی مطالعہ)

Abstract:

Pandemic: Facts and Fiction (A Special Study of the Urdu Fiction written amidst COVID-19 pestilence)

The theme of epidemics has been traced in the world literary works since antiquity. In ancient times, epidemics were considered a divine punishment to men for their sins. Identifying pandemic as a spatial phenomenon, the Greek historian Thucydides delineated its social and psychological stimuli. The pandemics have been considered to have been extremely impacting the social norms and collective psyche of respective land. However, the literature created quite amid a pandemic is, in most of the cases, incidental. Apart from slew of incidental writings, few great works have been emerged out the of sheer theme of pandemic. This article takes stock of fictional writings produced during COVID-19 pestilence in Urdu. One novel and a fairly good number of short stories were published by Urdu writers. Though most of them are incidental, they depict social, psychological, and political meanings attached to or drawn from pandemic.

Keywords: pandemic, COVID-19, Urdu literature, outbreak, mask.

عالمگیریت، صارفی معاشرت، سرمایہ داری نظام کے خلق کردہ جادوئی استعماری بیانیوں اور تشکیلی حقیقتوں کے عہد میں کووِڈ-۱۹ کا اچانک ظہور اور چند ماہ میں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لینا ایک ایسا وقوعہ ہے جسے اکیسویں صدی کے بڑے تاریخی تغیر کے طور پر ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ کوئی بھی بڑا وقوعہ یا سانحہ صرف انسان کے دل و دماغ اور سائیکی کو متاثر نہیں کرتا؛ سماجی زندگی کے ہر شعبے میں ایک ایسی تبدیلی برپا کرتا ہے جسے بعد میں مشخص کیا جاتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں وبا یا بیماری عام کو الوہی عذاب تصور کیا جاتا تھا۔ مذہبی صحائف اور قدیم لٹریچر اس تصور کی توثیق کرتے ہیں۔ ۷۰۰ قبل مسیح

میں لکھے گئے ادبی شاہ کار *Iliad* میں وبا کا تذکرہ اسی مناسبت سے ہوا ہے۔ اس رجزیہ داستان کے مطابق یونانی فوج میں شامل ایک شہزادے نے ایک کاہن کی توہین کی۔ اس کا یہ عمل اپالو دیوتا کی ناراضی کا باعث ہوا تو اس نے فوج پر آتشیں تیروں کی بارش کے ساتھ بیماری بھیجی جس نے فوج کی کمر توڑ دی۔ وبائے عام کی یہ تاویل انسانی بے بسی کا شاخسانہ ہے جو کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ یونانی مؤرخ تھوسی ڈیڈیس (Thucydides۔ پانچویں صدی قبل مسیح) نے اپنی کتاب *History of the Peloponnesian War* میں پہلی مرتبہ وبا کے محرکات، اثرات اور انسانی ردّ ہائے عمل کا عقلیت پسندانہ تجزیہ کیا۔ اس نے کتاب دوم کے باب ۷ میں شمالی افریقا سے پھوٹنے والی اس وبا کا ذکر کیا ہے جس نے پورے ایتھنز(Athens) کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تھوسی ڈیڈیس کے مطابق انسانوں کو اس بیماری سے نجات دلانے کے لیے کوئی معجزہ رونما ہوا نہ ہی کوئی دوا کارگر ثابت ہوئی۔ آخر کار لوگ خوف سے آزاد ہو کر بیماری پر توجہ دینا ہی چھوڑ دیتے ہیں[۱]۔ خدا اور قانون کے خوف سے آزادی کا نتیجہ اخلاقی اقدار کے خاتمے کی صورت میں نکلتا ہے۔ خود غرضی انسانی اقدار پر حاوی ہو جاتی ہے، اشیا اور دولت اپنی قدر کھو دیتی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک خدا اور قانون کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا نتیجہ ایک ہے، اس لیے ان کے اندر سے جرم اور گناہ کا خوف نکل جاتا ہے۔ ان کے خیال میں وہ پہلے ہی ایک سزا بھگت رہے ہیں۔ تھوسی ڈیڈیس کا تجزیہ وبا کو ایک مادی مظہر باور کراتا ہے جو معاشرے کی ساخت اور انسانی سائیکی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ وبا اور اجتماعی سانحات کی وجہ سے معاشرے کی ترکیب اور انسانی رویّوں میں حادثاتی طور پر کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں لیکن وباؤں اور سانحات کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تبدیلیاں دائمی نہیں ہوتیں۔

ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں طائف میں ۵۹۹ ہجری میں پھیلنے والی ایک وبا کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن عربی طائف شہر کی مفلوک الحالی کا ہولناک منظر پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب پروردگار نے انھیں اس مصیبت سے نجات دلائی اور اس بلا کو ان پر سے ٹال دیا اور انھیں امن و امان بخش دیا تو وہ پھر سے نافرمانیاں کرنے لگے[۲]۔ وبا کی مصیبت سے نجات پا لینے کے بعد اہل طائف کا اپنی پرانی روش پر لوٹ آنے میں یہ اشارہ ہے کہ کوئی بھی بڑا واقعہ انسان کی اجتماعی سائیکی کو تبدیل نہیں کرتا، تاہم یہ امر طے شدہ ہے کہ ایسی بڑے تاریخی واقعات سیاسی اور سماجی زندگی میں اتھل پتھل کا باعث ضرور بنتے ہیں۔ دوسری صدی عیسوی کی Antonine Plague جسے Plague of Gallen کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، سلطنت روما کی سیاسی اور روحانی مقتدرہ کے لیے روایت شکن ثابت ہوئی۔ جیفری چوسر(Geoffery Chaucer۔ چودھویں صدی عیسوی) کی *The Canterbury Tales* سیاہ موت(Black Death) کے نام سے موسوم اس وبائے عام کو

بہ طور خاص موضوع بناتی ہیں جس نے چودھویں صدی عیسوی میں انگلستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو شدت سے متاثر کیا تھا۔ وبائے عام سے پیدا ہونے والی صورت حال نے نہ صرف سیاسی مقتدرہ کے روایتی تصور کو ٹھیس پہنچائی بلکہ مذہبی مقتدرہ کی وہ طاقت، جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہ خدا کی طرف سے براہ راست تفویض ہوتی ہے، کو بھی معرض سوال میں لے آئی تھی۔ درحقیقت *The Canterbury Tales* بنیادی روایتی اعتقادات کے خلاف ایک ردِعمل تھا۔ بالخصوص *The Paradoner's Tales* وباؤ کا شکار انسانی ردِعمل کا اظہاریہ ہیں۔ یہاں لالچی اور خود غرض انسان موت کا مذاق اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہنگامی صورت حال سے نہ صرف عام آدمی بلکہ ڈاکٹروں کے اندر کا بے حس انسان بھی بیدار ہو جاتا ہے اور وہ بھی حالات کی سنگینی سے فائدہ اٹھاتے ہیں[۲]۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب وبا کے برپا کیے ہوئے اس معاشرتی تغیر کے اثرات کو کس طرح قبول کرتا ہے؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے ہمیں وبا کے زمانے میں وبا کے بارے میں لکھے جانے والے ادب اور کسی دوسرے زمانے میں وبا کے متعلق لکھے جانے والے ادب میں فرق کرنا چاہیے۔ وبا کے دورانیے میں لکھا جانے والا ادب اس معاشرتی تغیر کے فوری اثرات کو قبول کرتا ہے اور کسی نہ کسی سطح پر انھیں سمونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ حادثے کا اثر مستقل نہیں ہوتا چناں چہ ایسا ادب جو کسی سانحے کے فوری اثر کو بالائی سطح پر گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے، جلد ہی اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ تخلیقات جو کسی وبا/سانحے کے گزر جانے کے بعد معرض تحریر میں آتی ہیں، وہ بڑے تاریخی واقعات کو وسیع تناظر میں بہ روئے کار لاتی ہیں، واقعے کو استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور اپنی اطراف کھلی رکھتی ہیں۔ وہ کثیر معنویت کی حامل ہوتی ہیں اور آنے والے زمانوں میں ان کی توانائی نئی صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔

کووِڈ-۱۹ کی وجہ سے جنم لینے والی عالم گیر صورت حال میں ڈینیل ڈیفو (Danial Defoe۔وفات:۱۷۳۱ء) کے رسالے *A Journal of Plague Year* (۱۷۲۲ء)، ایلیسا ندرو مینزونی (Alessandro Manzoni۔۱۷۸۵ء-۱۸۷۳ء) کے ناول *Betrothed* (۱۸۲۷ء)، البرٹ کامیو (Albert Camus۔۱۹۱۳ء-۱۹۶۰ء) کے *The Plague* (۱۹۴۷ء)، اور گبریل گارشیا مارکیز (Gabriel García Márquez۔۱۹۲۷ء-۲۰۱۴ء) کے ناول *Love in The Time of Cholera* (۱۹۸۵ء) کی گونج تواتر سے سنائی دیتی رہی۔ مارکیز نے وبا کی صورت حال کو ایک تناظر کے طور پر برتا ہے اور کسی حد تک ایک استعارے کے طور پر بھی جب کہ اول الذکر بہ راہ راست وبا کو موضوع بناتے ہیں۔ یہ تینوں تخلیقات مختلف ادوار میں، مختلف مقامات پر پھوٹنے والی وباؤں کے متعلق ہیں۔ زمانۂ تخلیق میں زمانی و مکانی بعد کے باوجود، ان میں نشان زد کیے گئے سماجی، سیاسی، عوامی

رویّوں اور کورونا وبا کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاصر صورت حال میں حیران کُن حد تک مماثلت ہے (اور جزوی اختلاف بھی ہے)۔ مثلاً یہ تینوں ادب پارے ہمیں بتاتے ہیں کہ وبا کے بارے میں انسان کا ابتدائی ردِعمل انکار سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ اچانک نازل ہونے والی مصیبت کو قبول کرنے میں ہمیشہ متامل ہوتا ہے؛ افواہوں پر یقین کرتا ہے؛ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق رہتا ہے۔ دوسری طرف مقتدر حلقے پردہ پوشی کی کوشش کرتے ہیں، متاثرہ افراد اور اموات کے بارے میں غلط اعداد و شمار بتاتے ہیں یا اس کے اثر کو بہت کم ظاہر کرتے ہیں (البتہ موجودہ وبا کے بارے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ حکومتیں زیادہ اعداد و شمار بتا کر ہراس پھیلا رہی ہیں)۔ ڈینیل ڈیفو کا رسالہ *A Journal of Plague Year* ۱۶۶۵ء میں پھوٹنے والی وبا کے حوالے سے کچھ حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ ڈیفو کے مطابق حکومت ہلاک شدگان کی جو تعداد بتا رہی تھی، اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایلیسا ندرو مینز ونی کا ناول *Betrothed* ۱۸۲۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ۱۶۳۰ء کی وبا کو موضوع بناتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس وبا نے میلان (Milan)، ویرونا (Verona) اور وینس (Venice) کی آدھی آبادی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ یہاں بھی مقتدر حلقے عوام کو بے خبر رکھنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ شہزادے کی سال گرہ تقریب منعقد کی جاتی ہے تاکہ عوام میں وبا کا تاثر گہرا نہ ہو۔ میلان کے لوگوں میں حکومت کے خلاف غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ ناکافی حفاظتی اقدامات سے نالاں لوگ وبا کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص خطرے کی بات کرتا ہے تو یہ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں، بعد ازاں ڈاکٹر بھی اس استہزا میں عوام کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول اجتماعی نفسیات، عوامی و حکومتی ردِعمل اور خطرے سے مفاہمت جیسی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے۔

کامیو کا *The Plague* بیسویں صدی کے وسط میں شائع ہوا لیکن یہاں بھی عمومی انسانی رویّوں میں نمایاں تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔ اس ناول کا پس منظر ۱۹۴۰ء کے دوران میں فرینچ الجیرین قصبے اوران میں پھیلنے والی وبا ہے۔ لوگ وبا کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کے خیال میں وبا ان تک نہیں پہنچ سکتی کیوں کہ یہ مغرب میں ختم ہو چکی ہے [۴]۔

مذکورہ بالا ادبی تخلیقات انسانی ردہائے عمل اور ان کے محرکات کو تقریباً ایک جیسی صورت حال میں نمایاں کرتی ہیں۔ یہ متون ماقبل صنعتی دنیا کی تصویر پیش کرتے ہیں، ایک ایسی دنیا جس میں خبر کے ذرائع اور دوسرے ملکوں اور خطوں تک انسان کی رسائی محدود تر تھی جب کہ کورونا وبا کا آغاز ایک ایسے وقت میں ہوا جب اکیسویں صدی کا دوسرا دہا اپنے اختتام کے قریب تھا۔ اس عہد میں فاصلے، بے خبری اور عدم رسائی کا تصور معدوم ہو چکا ہے چناں چہ کورونا وبا کی وجہ سے جنم لینے والی صورت حال نے ایک عالم گیر فکری بحران کی صورت اختیار کر لی۔ اس جنگ میں انسان ایک طرف طبی میدان

میں وبا سے نبرد آزما ہوا تو دوسری طرف عقلیت اور قدامت پسندی، سائنس اور مذہب، استدلال اور تخیل اور حقیقت اور افواہ بھی ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس جنگ میں سیاست، سماجیات، معیشت اور مذہب کی شرکت ماضی کی نسبت زیادہ رہی ہے۔ اندازے، قیاسات، افواہیں اور اثرات مختلف ہونے کے باوجود تاریخ انسانی کی گزشتہ وباؤں اور حالیہ وبا میں جو کچھ حیران کُن حد تک مماثل دکھائی دیتا ہے وہ انسان کا عالم گیر رویّہ ہے۔ بہ قول اورحان پاموک (Orhan Pamuk۔پ:۱۹۵۲ء):

> انسانی تاریخ اور ادب میں وباؤں کے تذکرے میں جو مماثلت دکھائی دیتی ہے وہ ان کے پیدا کرنے والے جرثوموں اور وائرس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ہر دفعہ ہمارا رویّہ وبا کے بارے میں ایک جیسا رہا ہے[۵]۔

ایک مخصوص صورت حال میں ایک جیسے انسانی رویّوں کے باوجود جو بات مختلف زبانوں میں لکھے گئے ادب کو ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہے وہ لکھنے والوں کا تخلیقی طرزِ احساس ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو ارون دھتی رائے (Arundhati Roy۔پ:۱۹۶۱ء) کی اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ کسی فکشن نگار کے لیے اس سے زیادہ توہین آمیز بات کوئی اور نہیں ہوسکتی کہ وہ ان باتوں کو از سرنو بیان کرے جو اس سے پہلے دنیا کے دوسرے ملکوں میں بسنے والے لوگ اس سے بہتر، عالمانہ اور فصیح انداز میں پیش کرتے رہے ہیں[۶]۔ انسانی تاریخ میں معاشروں پر وباؤں کا اثر ہمیشہ paradoxical رہا ہے۔ وبا جہاں مرگ انبوہ اور جنگوں کا باعث رہی ہے وہیں انسان کی سائنسی ترقی اور طب کے میدان میں نئی دریافتوں کا محرک بھی ثابت ہوئی۔ انفرادی انسانی نفسیات پر وبا کا اثر منفی بھی ہوتا ہے اور مثبت بھی۔ اگر انسان کے اندر کا لالچی، خودغرض اور بےحس وحشی بیدار ہوتا ہے تو کہیں احساس اورمحبت اور دردمندی سے مالامال فرشتہ بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والا لارنس رائٹ (Lawrence Wright۔پ:۱۹۴۷ء) کا مختصر ناول *The End of October* وبا کے دوران عالمی سیاسی صورت حال، مقتدر عالمی طاقتوں کے طرز فکر، معاشی مسابقت کے ساتھ ساتھ انسانی باطن میں موجود دو مختلف اور متضاد دنیاؤں کو نشان زد کرتا ہے۔ امریکا کی مرکزی حکومت وائرس کو ایک حیاتیاتی ہتھیار قرار دے کر اس کا الزام اپنے روایتی حریف روس پر دھرتی ہے۔ امریکی صدر ناول کے مرکزی کردار کو ایسا ہی جوابی ہتھیار تیار کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن ہنری پارسنز اینٹی وائرس ویکسین بنانے کو ترجیح دیتا ہے اور اس فارمولے کو دنیا بھر میں پھیلا دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل بدترین حالات میں اعلیٰ انسانی قدروں کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔

ڈینیل ڈیفو، ایلیسا ندرو منیزونی، البرٹ کامیو، گبریل گارشیا مارکیز اور لارنس وائٹ کا مختلف تخلیقی تجربہ، زاویۂ نظر، طرز ادراک اور طرزِ احساس مشترک حالات اور رویّوں کو اپنے اپنے تناظر میں معنی خیز بناتا ہے۔ جدید (مابعدجدید) کا بڑا

وصف یہی ہے کہ یہ کسی مثالی اور آدرشی دنیا کے بجائے ایک حقیقی دنیا کو پیش کرتا ہے۔ یہ آدمی کی روح اور سماج کی تاریکی کو کسی لگی لپٹی کے بغیر دکھاتا ہے۔ یہ انسان کو اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ انسان کے اندر وہ شیطان بستا ہے جو خیر کی تمام قوتوں اور تصورات کو راکھ کر سکتا ہے۔ دوسری طرف یہی آرٹ (ادب) ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو انسان کے اندر کے شیطان اور اور اس کی بہیمت کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ چناں چہ جدید عہد میں ہی ڈسٹوپیائی (dystopian) تحریریں زیادہ لکھی گئی ہیں[۷]۔ جدید ادب میں ڈسٹوپیائی تحریروں کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم کیتھرین این پورٹر (Katherine Anne Porter۔۱۸۹۰ء–۱۹۸۰ء) کے ناول *Pale Horse, Pale Rider* (۱۹۳۹ء)، ایملی سینٹ جان مینڈل (Emily Saint John Mandel۔پ:۱۹۷۹ء) کے *Station Eleven* (۲۰۱۴ء) اور مارگریٹ ایٹ وڈ (Margaret Atwood۔پ:۱۹۳۹ء) کے ناول *The Year of the Flood* (۲۰۰۹ء) کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ وبا کے نتیجے میں ڈسٹوپیائی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ بالخصوص مارگریٹ ایٹ وڈ کا ناول ڈسٹوپیائی اور ایکوٹوپیائی (ecotopian) تکنیک کا مرکب ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا کا تصور پیش کرتا ہے جس میں وبا کے بعد کم و بیش تمام انسان ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ وبا بغیر پانی کے ایک سیلاب کی طرح ہے۔ بچ جانے والے انسان شدید احساس تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ ناول کی مرکزی کردار ان بچ جانے والے انسانوں میں شامل ہے۔ وہ بار بار اپنا نام لکھتی ہے کیوں کہ ایسی تنہائی کے مارے لوگ اپنا نام اور شناخت تک بھول جاتے ہیں۔ دنیا میں یہ تباہی حکومتوں اور ملٹی نیشنلز کمپنیوں کی بائیو انجینئرنگ (bioengineering) کی وجہ سے آتی ہے۔ مارگریٹ ایک ایسے خیالی جانور (Liobam) کا تصور پیش کرتی ہے جو شیر اور میمنے کا مرکب ہے۔ یعنی اس جانور میں درندگی اور معصومیت دونوں موجود ہیں۔

اردو ادب میں وبا کا تذکرہ سب سے پہلے ہمیں غالب کے ہاں ملتا ہے۔ جولائی ۱۸۶۱ء میں اپنے قریبی دوست میر مہدی حسین مجروح کے نام لکھے گئے ایک مکتوب میں غالب کے ان الفاظ کو ہم محض اس کی انانیت پر محمول نہیں کر سکتے: ''وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا وبا کیوں نہ ہو؟ ۔ ۔ ۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی[۸]۔'' اردو کے ''حیوان ظریف'' کی طرف سے وبا پر استہزا ایک جانب جنگ آزادی کے بعد دہلی میں انسانی زندگی کی بے توقیری پر دردمندانہ اظہار سے عبارت ہے تو دوسری طرف زندگی اور موت کے بیچ فاصلے کو کم کرتی وبا پر طنز زندگی کے حُسن، اس کی قیمت، موت پر ترجیح اور خواہش حیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پھر مولوی نذیر احمد آتے ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں ان کا تیسرا ناول توبۃالنصوح شائع ہوا۔ ناول کا آغاز دہلی میں وبا کے ذکر سے ہوتا ہے:

اب سے دور، ایک سال، دہلی میں ہیضے کا آغاز اتنا زور ہوا کہ حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس، چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا، ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اُجڑے پڑے تھے کہ دن دو پہر کو بھی جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند۔ ملنا جلنا، اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پُرسی وعیادت، باز دیدوزیارت، مہمان داری وضیافت کی کل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس۔ کہنے کو زندہ پر مردے سے بد تر۔ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔ یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑا رہا یا کسی بیمار کی تیمار داری کی یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا[۹]۔

ناول کا کبیری کردار نصوح اس وبا کا شکار ہوتا ہے۔ بیماری کے دوران میں ایک خواب دیکھتا ہے اور اس کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مذکورہ اقتباس میں زندگی کی بے ثباتی کا جو نقشہ ناول نگار نے کھینچا ہے، وہ مرکزی کردار کے فلسفۂ زندگی میں انقلاب کا محرک ہوتا ہے۔ ناول کا دائرہ مذہب، معاشرت، سیاست اور ادب تک پھیلا ہوا ہے۔ نو آبادیاتی تناظر میں اس متن کے کچھ مخصوص معانی متبادر ہوتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی ناقدین نے ناول کے بعض واقعات کو استعماری پراجیکٹ کا حصہ قرار دیا ہے لیکن وجود کی لایعنیت کے احساس سے فرد کے خیال وعمل میں جو تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے، اس کا محرک اوّل وبا کی ہول ناکی تھی۔ یہ واقعہ باور کراتا ہے کہ وبا یا کوئی بڑا سانحہ اگر اجتماعی انسانی سائیکی کو تبدیل نہیں بھی کرتا تو انفرادی سطح پر یہ تبدیلی ممکن ہے۔ بعد ازاں بیسویں صدی کے اردو فکشن میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''کوارنٹین''، ۱۸۹۶ء میں پھیلنے والے طاعون کے تناظر میں وبا اور تنہائی کی وحشت کو موضوع بناتا ہے۔ بعض مماثلتوں کی بنا پر موجودہ صورت حال میں اس افسانے کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ محمد مجیب کا کیمیا گر اور حسن منظر کا ناول وبا بھی قابل ذکر ہیں تاہم اس مضمون میں ہمارا سروکار اس اردو فکشن سے ہے جو کورونا وبا (۲۰۲۰ء) کے دوران میں لکھا گیا یا کسی نہ کسی حوالے سے اس وبا کو موضوع بناتا ہے۔

اس ضمن میں ہماری نظر سب سے پہلے کورونا وبا کے حوالے سے لکھے گئے اب تک کے واحد اردو ناول شہر خالی، کوچہ خالی کی طرف جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول منتشر خیالات، احساسات اور اثرات کا تخلیقی اظہار ہے۔ ناول کا ذیلی عنوان ''کورونا وبا کے شب و روز... ایک ناول'' بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس میں ناول کی مروجہ تکنیک سے انحراف برتا گیا ہے۔ ناول نگار نے کہیں خود کلامی، کہیں روزنامچے کی ہیئت، کہیں خواب اور کہیں فنتاسی کا سہارا

لیا ہے۔ ناول کی یہ تکنیک معرضِ سوال میں آ سکتی ہے لیکن سر دست یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ناول کا مرکزی کردار یا متکلم ایک بوڑھا شخص ہے، جس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا، تاہم ناول میں کچھ ایسے اشارے ضرور موجود ہیں جن سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ ناول نگار خود ہے۔ کچھ غیر منفعل کردار ہیں، جن سے متکلم کا مکالمہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں چند نا انسانی کردار مثلاً فاختہ، ہرن اور کچھ پرندے بھی ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ ناول وبا کے نتیجے میں جنم لینے والی فرد کی تنہائی، خاموشی، خوف اور معاشرتی زندگی، سماج، معیشت اور اقدار میں در آنے والی حادثاتی تبدیلیوں کا بیانیہ ہے۔ ناول ایک خاص سیاق میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک سطح پر یہ سیاق عالمی ہے کہ عالم گیر وبا کی وجہ سے انسان کو دنیا بھر میں ایک جیسی صورت حال درپیش ہے۔ اس دوران میں انسان کی اجتماعی سائیکی اور عالمی سماجی ساخت میں جو مشترک پہلو نمایاں ہوئے ہیں، یہ ان کو بیان کرتا ہے۔ دوسری سطح پر اس ناول کا سیاق خالصتاً مقامی ہے۔ ناول کا متکلم ایک مقامی شخص ہے اور اس کے واقعات لاہور شہر کے مختلف حصوں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ناول کا متکلم ایک فکری بحران کا شکار ہے۔ یہ بحران ذاتی/انفرادی بھی ہے اور سماجی، مذہبی، معاشرتی اور ماحولیاتی بھی۔

ناول کا آغاز ایک فاختہ کی اُڑان سے ہوتا ہے:

> اسے اذن دیا گیا تھا کہ اس کُرۂ ارض پر تب تک اُڑتی چلی جا جب تک تجھے کوئی ایسا مقام دکھائی نہ دے جائے جو پانیوں میں سے اُبھرا ہوا ہو، تلاش کر خشکی کے ایک ٹکڑے کو اور اس پر اُتر اور اس کی نشانی واپس لے کر آ۔ ۔۔ اسے تب تک اپنی اُڑان جاری رکھنا تھی جب تک نیچے ایک وبا کی مانند پھیلے پانیوں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا دکھائی نہ دے جائے اور وہ دکھائی نہ دیتا تھا[۲۱]۔

فاختہ پوری زمین کا چکر لگاتی ہے مگر ناکام لوٹتی ہے۔ ناول کے یہ ابتدائی صفحات paratext ہیں جو وبا کے عالم گیر پھیلاؤ کو علامتی حیثیت میں بیان کرتے ہیں۔ بیانیے کا آغاز لاک ڈاؤن کی وجہ سے اپنے کمرے میں محصور بوڑھے شخص (متکلم) کی خود کلامی سے ہوتا ہے۔ شہر کے بے ہنگم شور سے بیزار متکلم اس خاموشی اور تنہائی میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ ناول کے اگلے صفحات میں متکلم کے منتشر خیالات، مشاہدات، تاثرات اور پیش آمدہ واقعات انفرادی اور اجتماعی تبدیلیوں کا اشاریہ ہیں۔ وبا اپنے ساتھ موت کا خوف لاتی ہے جو تمام باطنی کیفیات پر حاوی ہوتا ہے۔ یہ خوف نہ صرف انسانی نفسیات کی پوشیدہ سطحوں کو آشکار کرتا ہے بلکہ رسمی معیارات پر بھی کاری ضرب لگاتا ہے۔ رسمی اخلاقی اور مذہبی معیارات خوف کی پہلی ضرب کے ساتھ ہی کس طرح ڈھیر ہو جاتے ہیں، متکلم کا درج ذیل مشاہدہ معاشرے اسی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے:

> بہت کم لوگ خصوصی طور پر مسجدوں میں جا کر نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن ان دنوں سب لوگ مسجدوں میں ہی نماز ادا کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔کیا وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ بندھن ڈھیلا پڑتا جاتا ہے اور اس

احساس جرم کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ بدستور مذہب سے جڑے ہوئے ہیں، مسجدوں میں جا کر نماز پڑھنا اپنی اول ترجیح سمجھتے ہیں۔ وہ حسب معمول اپنے اپنے گھروں میں عبادت کرنے پر مائل کیوں نہیں ہو رہے۔کیا تنہائی میں کورونا کی آفت سے سہم کر کسی آفت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انھیں اپنی مذہبی استقامت کے لیے گواہی درکار ہے جو مسجدوں میں میسر آسکتی ہے"[11]۔

معاشرے کی اجتماعی سوچ میں یہ تبدیلی اس کے کھوکھلے پن کی نشان دہی کرتی ہے۔ وبا کے دوران میں الکوحل ملے سینی ٹائزر کا ستعمال روز مرہ زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے لیکن یہاں اس کے حلال یا حرام ہونے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ اس ناول کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جہاں ناول نگار نے ماحولیات کا مقدمہ پیش کیا ہے۔عرصۂ وبا میں فطرت کی سرخوشی، معدوم ہوتے پرندوں کی واپسی اور فطرتی ماحول میں واضح خوش گوار تبدیلی اس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ وبا قوانین فطرت میں انسان کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور اس کی غلبہ پسندی کا نتیجہ ہے۔شہری آبادی میں آزادانہ گھومتے پھرتے ایک ہرن سے متکلم کی تخیلاتی ملاقات ہوتی ہے۔متکلم اور ہرن کے مابین مکالمہ ہوتا ہے۔ ہرن کا کہنا ہے:

آج تمھارے شہر ویرانے ہو گئے ہیں، بستیاں سنسان ہو گئی ہیں اور تم لوگ خوفزدہ چوہوں کی مانند اپنے اپنے گھروں کے پنجروں میں بند ہو چکے ہو۔اپنے اوپر نازل ہونے والی وبا کے جواز کبھی سائنس کی کتابوں میں تلاش کرتے ہو اور کبھی مقدس صحیفوں کا سہارا لیتے ہو اور جانتے ہی نہیں کہ تم نے جو ظلم کمایا ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے۔اس وبا نے ہماری بد دعاؤں سے جنم لیا ہے۔۔۔۔یہ وبا تو ابھی ابتدا ہے۔تم نے قدرت کے نظام کی خلاف ورزی کی ہے۔اس لیے تمھاری بساط سمیٹی جا رہی ہے، تمھیں اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے"[12]۔

یہاں ہرن کا کردار فطرت پر انسان کے بے جا تصرف اور استحصال کے خلاف ماحولیاتی مزاحمت کی علامت بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اسے اردو شاعری میں اپنی علامتی حیثیت پر بھی اعتراض ہے۔وہ اپنی (فطرت کی) جداگانہ حیثیت پر اصرار کرتا ہے۔ ناول میں فاختہ، سون چڑیا، طوطے، کوے، چیل، ہمنگ برڈ اور دیگر پرندوں کا متواتر ذکر بھی فطرت کی طرف مراجعت کی اہمیت باور کراتا ہے۔ ناول کا اختتام خشکی کی تلاش میں کرۂ ارض پر اُڑان بھرنے والی فاختہ کے ذکر پر ہوتا ہے۔متکلم کے سامنے خشک منڈیر پر بیٹھی فاختہ رجائیت اور حیات نو کا پیغام لے کر آئی ہے۔

خالد جاوید کا ناول ایک خنجر پانی میں پہلے ہندوستان سے اور حال ہی میں (جنوری ۲۰۲۱ء) پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ایک طرف نئے سرمایہ داری نظام کے پھیلاؤ، کارپوریٹ کلچر، آبی آلودگی اور وبا کو موضوع بناتا ہے تو دوسری طرف تیسری دنیا کی سیاست میں عسکری اثر رسوخ اور اجارہ داری کی حقیقت کو منکشف کرتا ہے۔ اس ناول کا موضوع کورونا وبا کے بجائے پانی کی آلودگی سے پھیلنے والا وبائی مرض ہے، تاہم وبا کے اثرات، عوامی ردعمل، وجود کی لایعنیت،

سماجی رویّوں میں تبدیلی اور مقتدر حلقوں کی بے حسی جیسے عوامل کورونا وبا کی پیدا کردہ صورت حال اور ایک خنجر پانی میں میں پیش کی گئی صورت حال میں مشترک پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ناول کے عنوان ایک خنجر پانی میں (۱۹۶۲ء کی پولش فلم Knife in the Water سے مستعار) علامتی حیثیت بھی خاص معنویت کی حامل ہے۔ پانی زندگی کی علامت ہے اور خنجر زندگی کو موت کے گھاٹ اتارنے والا ایک ہتھیار ہے۔ نئے سرمایہ داری نظام کی خلق کردہ صارفی معاشرت میں فرد محض ایک کموڈیٹی (commodity) ہے اور وجود ایک لا یعنی شے۔ فطرت اور قانون فطرت کا استحصال اس نظام کی اساس ہے۔ چناں چہ یہ ایک ایسا خنجر ہے جو پانی (زندگی اور فطرت کا اہم مظہر) کے سینے میں اُتر کر اسے موت سے ہم کنار کر رہا ہے۔ بعینہٖ مقتدر سیاسی قوتوں کے لیے سب سے اہم ان کے اقتدار کا استحکام اور اس کی طوالت ہے۔ بلا سے یہ مقصد انسانی اور نا انسانی زندگی کی قیمت پر حاصل ہو۔ ناول کے شروعاتی صفحات گرد و غبار میں اٹے، ایک گنجان اور بے ہنگم شہر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس شہر میں آلودہ پانی سے پھوٹنے والی وبا کے اثرات بہت جلد پوری معاشرتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ سماجی اور خاندانی نظام میں ٹوٹ پھوٹ، رشتوں، رویّوں اور اقدار میں پڑنے والی دراڑ انسانی اعمال کے نتیجے میں انسانی بے بسی کی ایک ہول ناک تصویر پیش کرتی ہے۔ شہر کی انتظامیہ کو وبا کی وجہ ڈھونڈنے میں مشکل نہیں ہوتی لیکن اس کا منبع تلاش کرنا ایک معمہ بن جاتا ہے۔ ناول کا اختتام (اور وبا کا بھی) ایک چونکا دینے والے واقعے پر ہوتا ہے۔ ایک پلمبر فوج کے زیر انتظام ممنوعہ علاقے کی طرف جا نکلتا ہے جہاں یہ حقیقت کھلتی ہے کہ جس جگہ سے شہر کو پانی سپلائی کیا جاتا ہے وہاں ہائی ٹینشن ٹاور سے بجلی کا تار گرا ہے۔ جس کی وجہ سے سیوریج کا پائپ پھٹ گیا۔ قریب ہی پانی کی سپلائی لائن تھی۔ بجلی گرنے سے وہاں کچھ مویشی مر گئے تھے جنھیں اٹھانے اور پائپ مرمت کرنے کی زحمت کسی نے نہیں کی۔ بدبودار جراثیم واٹر سپلائی لائن میں ملتے رہے اور آلودہ پانی کی وجہ سے لوگ مرتے رہے۔ ڈاکٹر اس دریافت کا کریڈٹ خود لیتے ہیں اور عوام کو بتایا جاتا کہ یہ کوئی وائرس نہیں تھا، پانی کا ایک معمولی مسئلہ تھا جسے حل کر لیا گیا ہے۔ حقیقت جاننے والے پلمبر کو ملٹری کے ممنوعہ علاقے میں گھسنے کی پاداش میں گولی مار دی جاتی ہے اور یہ راز ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ناول بہ راہ راست کوِڈ-۱۹ کو موضوع نہیں بناتا لیکن اس وبا کے حوالے سے کچھ سوالات اور خدشات کو تقویت ضرور دیتا ہے اور وہ یہ کہ کیا کورونا وبا قدرتی طور پر جنم لینے والا کوئی وائرس ہے؟ فطرت کا انتقام ہے؟ کوئی حیاتیاتی ہتھیار ہے؟ سرمایہ داری نظام کی کوئی نئی چال یا کسی سرد جنگ کا نتیجہ ہے؟ شاید اس راز سے بھی کبھی پردہ نہ اٹھ سکے۔ آخر ہم سب عام آدمیوں کو ممنوعہ علاقے میں جانے کی اجازت کب ہے؟

آصف فرخی کی ادارت میں شائع ہونے والے معروف کتابی سلسلے دنیا زاد کا ''وبا نمبر'' اکتوبر ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا[۳۱]۔ دنیا زاد کے اس شمارے میں شامل نور الہدیٰ شاہ کا افسانہ ''المیہ'' ہیومنزم (humanism) کے زائیدہ انسانی برتری اور فضلیت کے تصور پر گہری چوٹ لگاتا ہے۔ یہ علامتی افسانہ انسان پسندی کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ کرۂ ارض کی یہ تاریخ ایک غیر زمینی/خلائی مخلوق کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے زمین اور اس کی مخلوقات کے ساتھ روا رکھے گئے انسانی سلوک کی تاریخ انسان نے اپنے قائم کردہ معیارات پر لکھی ہے پھر یہ کیوں کر ممکن ہے یہ تاریخ تعصب سے پاک ہو؟ مذکورہ افسانے میں غیر زمینی کردار کی زبان سے انسانی تاریخ کا احوال اس تاریخ کی جانب داری پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خلائی کردار پہلی مرتبہ زمانۂ قبل مسیح میں کرۂ ارض پر اترتا ہے۔ یہ سکندرِ اعظم کا عہد ہے۔ اس عہد میں زمین پر فطرت اپنی خام اور محفوظ حالت میں موجود تھی۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اس سیارے پر بسنے والی مخلوق، اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اشرف المخلوقات پر قدرت کی عنایات دیکھ کر رشک میں مبتلا ہوتا ہے۔اس کا گزر ایک اکیڈمی سے ہوتا ہے جہاں ایک ادھیڑ عمر استاد(ارسطو۔چوتھی صدی قبل مسیح) اپنے شاگردوں کو تعلیم دے رہا ہوتا ہے۔ اسے سمجھ آتی ہے کہ علم اور شعور کی بنا پر یہ مخلوق واقعی قدرت کی عنایات کی مستحق ہے مگر سکندر اعظم کے دربار میں طبقاتی امتیاز اور اس کے جنگی جنون کو دیکھ کر اس کا یہ تصور پاش پاش ہوجاتا ہے۔ یہیں اس پر ارسطو کے ''تصور المیہ'' کے بھی نئے معانی منکشف ہوتے ہیں۔''سکندر اعظم کے دربار میں اس پر انکشاف ہوا کہ یہ اشرف مخلوق رتبے میں دراصل ایک جیسی نہیں ہے۔ مٹھی بھر مخلوق اشرف ہے ورنہ اکثریت کم تر ہے۔ جو اشرف ہے،اس کی مٹھی میں سب کی جان ہے اور اسے دراصل کمزور کا خوف ہی سب سے اشرف بناتا ہے[۳۲]۔'' طاقت کے رشتوں سے متشکل ہونے والا یہ وقفۂ تاریخ انسان پر انسان کی فتح کا زمانہ تھا۔ اس عہد میں انسانی طاقت کا اظہار جنگ و جدل اور قتل و غارت کی صورت میں ہوتا ہے؛ انسان انسان کے ساتھ برسر پیکار رہا۔ اس کی غلبہ پسند طبیعت ابھی فطرت کی تسخیر کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

دوسری مرتبہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ مابعد صنعتی عہد میں زمین کی سیر کے لیے آتا ہے۔ اب کی بار اس کا پہلا پڑاؤ یورپ اور امریکہ کا جہان حیرت ہے۔ جہاں شہر کی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں خود انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تیسری مرتبہ دنیا کی طرف پلٹتا ہے تو برباد بستیوں میں پناہ ڈھونڈتے، خاک اور خون میں لتھڑے، وحشت زدہ لوگوں کو دیکھ کر ایک بار پھر اس پر اشرف المخلوقات کے مفروضے کا اندرونی تضاد ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس اشرف مخلوق نے ایسے ہتھیار بنا لیے ہیں جو آن واحد میں دنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے

ہیں۔ یہ جدید تہذیب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee_۱۸۸۹ء-۱۹۷۵ء) نے برسوں پہلے *Mankind and Mother Earth* میں لکھا تھا: ''ہمارا کرۂ حیات انسان کے لیے واحد قابل رہائش مقام ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے لیکن انسان نے اب اس کو غیر آباد کرنے کی طاقت حاصل کر لی ہے[۱۵]۔'' فطرت اور خود انسان کے لیے انسان کی بربریت دیکھ کر خلائی مخلوق یہاں دوبارہ نہ آنے کا عزم لے کر یہاں سے نکل جاتی ہے مگر اپنے بیٹے کی ضد پر اسے ایک بار پھر یہاں اترنا پڑتا ہے۔ اب کی بار اکیسویں صدی کی دوسری دہائی ختم ہونے کو ہے۔ وبا نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ زمین کو آباد اور فطرتی حُسن سے مالا مال دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ شاید اشرف المخلوقات کو اس سیارے سے اُٹھا لیا گیا ہے لیکن اس کا بیٹا اسے بتاتا ہے کہ یہ سب ایک بیماری کی وجہ سے ہوا ہے جس نے انسان کی ساری طاقت سلب کر لی ہے۔''اب اشرف المخلوقات پنجرے میں بند ہے اور کرۂ ارض آزاد ہو چکا ہے۔'' خلائی کردار انسان کے اس المیے کو اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ تب اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ انسان کی زندگی درحقیقت اس کی سانس میں نہیں، ایک دوسرے کے لمس میں تھی۔ افسانے کے اختتام پر سفید کوٹ میں ملبوس ایک شخص (ڈاکٹر) دکھائی دیتا ہے جو انسان کی سانسیں بحال کرنے کا کام کر رہا ہے، یہی اصل اشرف المخلوقات ہے۔ افسانے کے اختتامی حصے میں مصنفہ کے تصورِ فطرت کا تضاد بھی سامنے آتا ہے۔ خلائی کردار کی زبان سے کہے گئے یہ الفاظ کہ ''اپنی مخلوق کے بغیر یہ کرۂ ارض کچھ بھی نہیں۔۔۔کچھ بھی نہیں۔۔۔اس کا اصل حُسن اس کی مخلوق ہی تو تھی۔ یہ گل وگلزار، صحرا اور سمندر، ہوا، آگ اور پانی! یہ سب اس مخلوق کے لیے ہی تو تھا[۱۶]۔'' انسان پسندی کے خلاف افسانہ نگار کے قائم کیے گئے مقدمے کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ فلسفۂ انسان پسندی کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی ہے کہ زمین پر موجود تمام مظاہر انسان کے لیے ہیں۔ یہ مفروضہ انسان کو فطرت کے استحصال کا جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ سوال قاری کو پریشان ضرور کرتا ہے کہ اگر زمین کے سارے مظاہر انسان کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں تو انسانی اعمال کے خلاف افسانے میں مقدمہ پیش کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

''کورونا اور قرنطینہ'' محمد حمید شاہد کا افسانہ ہے (افسانے کا لوکیل اسلام آباد ہے جو کہ افسانہ نگار کا رہائشی شہر ہے؛ مصنف کے دوست ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ذکر سے افسانے پر ایک سوانحی تحریر کا گمان گزرتا ہے)۔ یہاں افسانہ نگار کا ایک ذاتی تجربہ پھیل کر ایک اجتماعی انسانی تجربہ بن گیا ہے۔ یہ افسانہ بنیادی طور پر وبا کے متعلق مصدقہ اور غیر مصدقہ خبروں، افواہوں بالخصوص سوشل میڈیا کے ذریعے سے پھیلائے گئے خوف و ہراس کی انتہائی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ خبروں تک عام رسائی اور تشکیلی حقیقتیں فرد کی نفسیات اور معاشرتی اقدار کو کس طرح متاثر کرتی ہیں، یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ افسانے کے متکلم کو واٹس ایپ پر

ایک وڈیو موصول ہوتی ہے۔ وڈیو میں کورونا کی وجہ سے وفات پا جانے والے ایک شخص کی لاش اور اس لاش سے خوف زدہ افراد کو دکھایا گیا ہے۔ یہ وڈیو دیکھنے کے بعد متکلم کے اندر وبا کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے۔ محض ٹھنڈ لگنے کی وجہ سے آنے والی ایک چھینک کے بعد وہ اپنے اندر کورونا کی بتائی گئی علامات محسوس کرتا ہے اور اس خیال سے کہ یہ بیماری اس کی بیوی اور بچوں میں منتقل نہ ہو، وہ خود اپنے گھر کے ایک کمرے میں قرنطینہ کر لیتا ہے۔ جلد ہی وہ وہم اور خوف کی کیفیت پر قابو پا لیتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح صحت مند ہے لیکن اس مختصر وقت میں وبا کا خوف، افواہیں اور میڈیا کا پیدا کردہ ہراس، اعتماد، محبت، احساس اور رشتوں میں ایک نہ پُر ہونے والی دراڑ ڈال چکا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آتا ہے تو اس کے بچے اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور اس کی بیوی اس کے اور بچوں کے درمیان تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ ''مرگ عام نعمت ہے'' پہلے دنیا زاد کے ''وبا نمبر'' میں اور بعد ازاں ان کی کتاب ایک زمانہ ختم ہوا ہے میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ افسانہ اشرافیائی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔ وبا یا اس جیسا کوئی بڑا تاریخی وقوعہ فرد کی ذات، نفسیات اور معاشرتی قدروں کو متاثر کرتا ہے جب کہ اہل سیاست اور مقتدر حلقے غیر معمولی حالات کو مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایسی صورت حال میں جب موت اور زندگی کے بیچ فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے اور مستقبل کی غیر یقینی بہت واضح ہو جاتی ہے، کسی کے اندر مستقبل کی منصوبہ بندی کا حوصلہ کس یقین سے آتا ہے؟ یہ اپنی جگہ ایک قابل غور سوال ہے؟ افسانے کا paradoxical عنوان شاید اسی رمز کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مرگ عام جو عوام کے لیے زحمت ہے، وہ اہل سیاست کے لیے نعمت بھی ہو سکتی ہے۔ یووال نوح ہراری (Yuval Noah Harari۔ پ:۱۹۷۶ء) نے کورونا وائرس کی وجہ سے جنم لینے والے عالمی بحران کے نتیجے میں مستقبل کے دو اہم ممکنات کو نشان زد کیا ہے: ''پہلا مطلق العنان نگرانی اور شہری اختیار اور دوسرا قوم پرستی اور عالمی اتحاد'' ہراری اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ ایمرجنسی عملیات زندگی کا حصہ بن کر تاریخی عمل کو تیز تر کر دے گی۔ وہ فیصلے جو عام حالات میں برسوں کے غور و فکر کے طالب ہوتے ہیں، چند لمحوں میں ممکن العمل ہو جائیں گے۔ نیز سب سے بڑا خطرہ عوام کی نگرانی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ غصہ، خوشی، بوریت اور محبت بھی ایسے ہی حیاتیاتی مظاہر ہیں جیسے بخار اور کھانسی۔ وہی ٹیکنالوجی جو کھانسی کو شناخت کر سکتی ہے، قہقہوں کو بھی پہچان سکتی ہے۔ اگر حکومتیں اور تجارتی کمپنیاں ہمارے حیاتیاتی اعداد وشمار وسیع پیمانے پر جانچنے لگیں تو وہ ہمیں خود ہم سے بھی بہتر سمجھنے لگیں گی۔ وہ نہ صرف ہمارے محسوسات کی پیش گوئی کر سکیں گے بلکہ ان پر اثر انداز بھی ہو سکیں گے۔ وہ جو چاہیں ہمیں فروخت کر سکیں گے، چاہے وہ کوئی صنعت ہو یا سیاست دان[۱۶]۔

لا محدود اختیارات اور کلی اجارے کی خواہش ''مرگ عام نعمت ہے'' کے مرکزی کردار ولی عہد شہزادے (پہچان واضح نہیں) کی سوچ، طرز فکر اور عمل میں نظر آتی ہے۔ شہزادہ اکیسویں صدی کی مقتدر قوتوں کی علامت ہے جو بہ راہ راست جنگ اور قبضے کی نسبت علم اور میڈیا کے ذریعے اذہان کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی حکمت عملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ سلطنت میں وبا کا آغاز ابھی ہوا نہیں لیکن شہزادے کا پیش بین ذہن مستقبل کی من مانی صورت گری کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دیتا ہے۔ اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اسے کسی خفیہ ترین مقام کی تلاش ہے جس کے لیے وہ خود اپنا دشمن بن کر سوچتا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں دشمن کی سب زیادہ ذاتی چیز اس کا خفیہ ٹھکانہ ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں کسی مقام، ٹھکانے، سرگرمی حتیٰ کہ خیالات کا ذاتی اور خفیہ نہ رہ جانا مابعد جدید فرد کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ فائبر عہد میں نگرانی پر مامور مصنوعی سیارے، سی سی ٹی وی کیمرے، انسٹا گرام، واٹس ایپ، فیس بک اور دیگر موبائل Apps کے ذریعے فرد کی ذاتی زندگی اور خیالات تک رسائی نے نہ صرف فرد کے جسم بلکہ اس کی روح تک کو برہنہ کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ برہنگی آج بھی بلیک میلنگ اور فرد کے جسم وذہن کو اپنے قابو میں رکھنے کا سب سے اہم ہتھیار ہے۔ شہزادہ اپنے آٹھ مصاحب کے ساتھ ایک خصوصی اجلاس کے لیے ایک خفیہ ترین مقام کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ ایک مکمل خالی ہال ہے۔ دیواروں اور دیواروں پر آویزاں دو تین بے جان تصاویر کے علاوہ یہاں کچھ بھی نہیں لیکن ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' افسانہ نگار نے شہزادے اور اس کے آٹھ مصاحب کے نام اور پہچان کو خفیہ رکھا ہے، ان کی آپسی گفتگو کو بھی ان کی زبان سے ظاہر نہیں کیا گیا۔ قارئین تک یہ گفتگو اس ہال میں موجود ایک رقاصہ کے پورٹریٹ اور قتل کے گئے ایک سیاہ فام جوان کی تصویر کے ذریعے پہنچتی ہے۔ شہزادے کی سلطنت ہنوز وبا کی زد میں نہیں آئی لیکن اس کا خطرہ موجود ہے۔ شہزادہ عام لوگوں کو موت سے بچانے کے لیے پیشگی حفاظتی اقدامات نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں موت خدائی فیصلہ ہے جس میں مداخلت کا اختیار انسان کو نہیں۔ وہ صرف بچ جانے والوں کی روحوں کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا ہے تاکہ عوام کے جسم، روح اور دماغ پر اسے مکمل اختیار حاصل ہو جائے۔ مطلق العنانیت اور کلی اختیار کی خواہش صرف اس صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ لوگ وبائے عام کی وجہ سے موت کے خوف کے عادی نہ ہو جائیں۔ انھیں اس خوف سے نکالنا اشد ضروری ہے تاکہ وہ آئندہ کسی اور خوف میں آسانی سے مبتلا ہو سکیں۔ خفیہ اجلاس میں ایک مصاحب کی طرف سے یہ تجویز بھی سامنے آتی ہے سب کے لیے صرف ایک کتاب کا مطالعہ ضروری قرار دیا جائے۔ ''صرف ریاست کے مقررہ لوگ وہی ایک کتاب پڑھ کر سنائیں اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھائیں''، اس کے علاوہ باقی سب کتابوں پر پابندی لگا دی جائے۔

اس تجویز کا بدیہی مطلب یہ تھا کہ واحد معنی کی اجارہ داری قائم کی جائے۔ واحد معنی کا تصور پرانے کلونیل ازم کا اہم ترین حربہ تھا۔ یہ اپنی مرضی کا علم اور اس کی من مانی تعبیر مسلط کرتا ہے اس کے برعکس تکثیریت سوچ کے ایک سے زائد در وا کرتی ہے، جہاں سے اجارہ داری اور تسلط کے خلاف آوازیں اُٹھتی ہیں۔ نئی کلونیل حکمت عملی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ مخالف آوازوں کو تا دیر دبایا نہیں جا سکتا۔ چناں چہ شہزادہ اس تجویز کو مسترد کر دیتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک نیا حربہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

> انسان جلد بدل جاتا ہے۔وہ جلد اُکتا جاتا ہے۔وہ ان چیزوں سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور ان سے بھاگ جاتا ہے جن کے لیے وہ زمانے بھر سے لڑا ہوتا ہے۔وہ جلد بھول جاتا ہے:اپنے محسنوں کو،سخت مشکلوں کے بعد حاصل کیے گئے سبق کو،صدیوں کے تجربوں سے کشید کی گئی دانش کو۔ہم انسانی فطرت کونہیں بدل سکتے۔ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس کی فطرت کے کسی اصول کو اس کے دوسرے اصولوں پر غالب کر دیں۔انسان سب بھول سکتا ہے،ان لوگوں کونہیں جنھوں نے اسے معمولی سا رنج پہنچایا۔ (یہ کہتے ہوئے شہزادے نے سب کی طرف گہری نگاہ سے دیکھا تھا) آدمی کی انا جس قدر احسان فراموش ہے،اس سے زیادہ کینہ پرور ہے۔ہم اس اصول کی مدد سے اپنی قوم کے انسانوں کی روحوں کی نئی تعمیر کریں گے [۱۸]۔

سلطنت میں وبا کا آغاز اس اجلاس کے بعد ہوتا ہے۔ وبا کے خاتمے پر ملک کی نصف سے کم آبادی زندہ بچتی ہے۔ احسن اقدامات کے صلے میں (کون سے؟) ولی عہد کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔ زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد اس نے فوری طور پر کچھ فرامین جاری کیے: اول یہ کہ لوگ شکرانے کی نماز ادا کریں اور صدقہ وخیرات دیں کہ خدا نے اس ابتلائے عام میں قوم کو انتشار سے بچایا۔ دوسرا فرمان اجلاس میں شریک ہونے والے آٹھ لوگوں میں سے چار افراد کی غداری کے الزام میں موت کا تھا۔ تیسرا فرمان ملک میں موجود سب کتابوں، مجسموں، تصویروں اور موسیقی کی تفاصیل کو بہ حق سرکار ضبط کرنے اور مستقبل میں علم وفن کی تخلیق کے جدید ضابطوں کے متعلق تھا۔ آخری فرمان ہمسایہ ملک کے خلاف جنگ کا تھا کہ بادشاہ کے خیال میں یہ وبا اس کی پھیلائی ہوئی تھی۔ آخری دو فرمان مابعد کورونا ممکنہ عالمی منظر نامے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کتابوں اور آرٹ کے نمونوں کی ضبطی توبۃالنصوح میں کتابوں کے جلائے جانے کے واقعے کے مماثل ہے۔ وہاں یہ واقعہ علم، زبان اور ادب پر استعمار کے اجارے اور برصغیر میں نو آبادیاتی عہد کے نقطۂ آغاز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں پرانی کتابوں اور آرٹ کی ضبطی کا حکم کچھ خدشات کو جنم دیتا ہے۔ کورونا وبا کے گزر جانے کے بعد عالمی سیاست کیا رُخ اختیار کرے گی؟ کوئی نیا کلونیل آرڈر جاری ہوگا یا کسی نئی سرد جنگ کا آغاز ہوگا؟ وبا گزر جانے کے چند سال بعد منظر نامہ واضح ہو جائے گا، ممکن ہے صورت حال واضح ہونے میں ڈیڑھ سو سال لگ جائیں۔

فاطمہ حسن کا مختصر افسانہ ''مکر کرنے والے'' اس تیقن پر اساس رکھتا ہے کہ عالم گیر وبا قدرت کی ایک تدبیر ہے۔ سرمایے کی ہوس اور منافع کی بے لگام دوڑ میں انسان جس طرح فطرت کے خلاف بر سر پیکار ہوا، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ کرۂ ارض پر خیر و شر، انسان اور فطرت کے مابین توازن کو برقرار رکھنے کے لیے قدرت مداخلت کرتی۔ افسانے کے دو کرداروں دادی اور پوتی کے مابین سادہ مکالمے اسی تلخ حقیقت کو منکشف کرتے ہیں۔

افسانہ ''ایک تنہا دن'' وبا پر اُٹھنے والے سوالات سے جنم لیتا ہے۔ شہلا نقوی کا یہ افسانہ قاری کی توجہ اس عالم گیر سماجی حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہے کہ صارفی معاشرت کے کنزیومر (صارفی ڈنگر) کو ضرورتوں کے جال میں کچھ اس طرح پھنسا دیا گیا ہے کہ اس کے سارے قویٰ اور حواس مختل ہو گئے ہیں۔ یہ ہر ظلم کو اپنا مقدر سمجھ کر قانع ہو جاتا ہے۔ اس لیے سوال اٹھانے یا احتجاج و مزاحمت کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ افسانے میں ''جگ سا پزل'' ذہنی افلاس اور مختل حواس کی علامت ہے۔ ہماری (معاصر فرد کی) سوچ اور طرز فکر کے ''جگ سا پزل'' کے کئی ٹکڑے گم ہو گئے ہیں یا گم کر دیے گئے ہیں۔ معاصر فرد آج کی تیز رفتار مادی دنیا میں اس طرح نہیں سوچتا، جس طرح اسے سوچنا چاہیے۔ انسانی زندگی کے جگ سا پزل کے کون سے ٹکڑے کھو گئے ہیں ان کی کھوج ضروری ہے۔ عالم گیر وبا انسان کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ جو کھو چکا ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔ مزید کھونے کا امکان باقی ہے اور باقی رہے گا تاآنکہ انسان درپیش سوالات کے جوابات تلاش نہ کر لے۔

مذہبی اسطورہ یاجوج ماجوج کی پیچیدہ اور کثیر معنوی علامت ہر زمانے میں اپنی معنویت باور کراتی ہے۔ عہد نامہ عتیق کی کتاب حزقیال کے مختلف ابواب اور قرآن حکیم کی سورہ کہف (آیت ۹۳ تا ۹۹) کے مطابق یاجوج ماجوج ایک نافرمان اور غاصب قوم تھی۔ بعض مفسرین نے انھیں نوح پیغمبرؑ کے بیٹے یافث کی اولاد بتایا ہے۔ جب ان کی نافرمانی اور ظلم حد سے تجاوز ہوا تو اللہ کے حکم اور نصرت سے ذوالقرنین بادشاہ نے لوہے اور تانبے کی ایک دیوار کھڑی کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے قید کر دیا۔ موجودہ وبا کے تناظر میں علی تنہا نے اپنے افسانے ''یاجوج ماجوج نے کرونا سے کیا کہا'' میں اس اساطیری متن کی بنیاد پر ایک اور متن تیار کیا ہے۔ افسانہ نگار نے personification کی تکنیک برتی ہے اور کورونا وائرس کو ایک زندہ کردار کے طور پر پیش کیا ہے؛ بالخصوص اس وائرس کی ظاہری شکل (تاج) کو ایک تاریخی حقیقت کی علامت بنایا ہے۔ کورونا وائرس یاجوج ماجوج کو اپنی کامیابی کی خبر سنانے جاتا ہے مگر وہ اس پر خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔ انھیں اپنے جد امجد کا یہ قول یاد ہے کہ جس کے سر پر تاج ہوتا ہے، وہ برباد ہوتا ہے۔ وہ کورونا کو خبر دار کرتے ہیں کہ تم انسان کو نہیں مار رہے، درحقیقت وہ تمھیں مار رہا ہے[۱۹]۔ یہ بین المتنی تمثیل باور کراتی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ قدرت نے

انسان کو علم اور شعور کی صفات سے سرافراز کیا ہے۔ انسان کو شکست دینے کی خواہش مند قوتیں یاجوج ماجوج کی طرح ہمیشہ شکست سے دوچار ہوئی ہیں۔ کورونا کی جیت بھی عارضی ہے، انسان بہت جلد اس پر فتح پا لے گا اور کورونا ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا۔

''۷+۶ = ۱۳ دن'' ابابیل اورنگ زیب کا افسانہ ہے جو بچوں کی نفسیات پر مرتب ہونے والے وبا کے اثرات کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک سماجی ویب سائٹ daanish.pk پر ۱۶ اپریل ۲۰۲۰ء کو شائع ہوا۔ یہ پوسٹ ماڈرن تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ افسانے کا راوی بار بار کہانی میں مداخلت کرتا ہے۔ وہ ابتدا میں ہی بتا دیتا ہے کہ کہانی کا اختتام مرکزی کردار کی موت پر ہو گا۔ وہ موت کے وقت میں باقی رہ جانے والے دنوں، گھنٹوں اور منٹوں کا حساب ساتھ ساتھ بتاتا جاتا ہے لیکن کردار کی مرکزیت کا فیصلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ افسانے کا ایک بے نام کردار کورونا کی علامات ظاہر ہونے پر خود کو اپنے گھر کی بالائی منزل پر واقع اپنی مطالعہ گاہ میں قرنطینہ کر لیتا ہے۔ اس کی ٹیسٹ رپورٹ آنے میں ابھی ۱۳ دن باقی ہیں۔ یہ ۱۳ دن وہ خوف، تنہائی اور مایوسی سے مسلسل لڑتے ہوئے گزارتا ہے۔ پرندوں سے دوستی اور کتابوں کا مطالعہ مایوسی کو شکست دینے میں اس کا مددگار ہوتا ہے۔ تنہائی کے ایام میں کئی بار مایوسی اس پر حملہ آور ہوتی ہے لیکن اپنی قوت ارادی سے وہ اسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آخری دن اداسی کی ایک شدید لہر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اس کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ راوی کے مطابق یہ موت کا دن ہوتا ہے۔ وہ جس کمرے میں بند ہے، اس کی کھڑکی کے عین سامنے والی کھڑکی میں دو بچے روزانہ صبح کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ وہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ان بچوں کی حرکات و سکنات کا بھی مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ یہ معصوم اپنے والدین کی طرف سے مسلط کردہ جبریہ تنہائی کی وجوہات سے ناآشنا ہیں۔ ان کی بے خبر حیرت، بے زاری اور اکتاہٹ کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایک بچہ لوہا کاٹنے والے بلیڈ کی مدد سے کھڑکی کی سلاخ کاٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سر باہر نکال لیتا ہے لیکن مڑی ہوئی سلاخ اس کی گردن میں اتر جاتی ہے۔ وہ یکسانیت کے حصار کو توڑنے کی خواہش میں زندگی کے حصار سے بھی نکل جاتا ہے۔

دیدبان کے شمارہ نمبر ۱۲ میں شائع ہونے والا عماریاسر کا افسانہ ''نووا ہائٹس'' بھی ڈپریشن کی انتہائی حالت کو پیش کرتا ہے[۲۰]۔ بیرون ملک مقیم ایک نوجوان وبا کی وجہ سے اپنے ایک قریبی دوست اور محبوبہ کو کھو چکا ہے۔ ہسپتال میں ایک نرس ڈپریشن کا شکار ہو کر خودکشی کر لیتی ہے۔ یہ واقعہ اس کی مایوسی میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے۔ افسانے میں

ڈپریشن اور احساس تنہائی اپنے انتہائی مقام پر نظر محسوس ہوتا ہے۔اپریل ۲۰۲۰ء میں خاور چوہدری کے افسانوں کا مجموعہ طلسم کہن کے نام سے شائع ہوا جس میں پیش لفظ اور دو دیباچوں کے ساتھ ۲۱ افسانے شامل ہیں[۲۱]۔ یہ تمام افسانے کورونا وبا کو موضوع بناتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مجموعہ کنواں کے نام سے شائع ہوا، جس کے مصنف محمود احمد قاضی ہیں[۲۲]۔ یہ مختصر کتاب اپنے دامن میں ۲۳ مختصر افسانوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مذکورہ دونوں کتابوں میں شامل افسانے وبا کی وجہ سے جنم لینے والی معاشرتی تبدیلیوں، فرد کی نفسیاتی الجھنوں، رشتوں میں بگاڑ، معاشی بدحالی اور خوف، ڈپریشن اور احساس تنہائی جیسی کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ سلمان بخاری کی کتاب سیارگی میں شامل ان کا افسانہ ''ریپبلک آف ماسک'' ایک ڈسٹوپیائی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ وبا کے دوران لوگ ماسک کے اس حد تک عادی ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنے وجود کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ وبا گزر جانے کے دس سال بعد کی دنیا ایک عجیب منظر پیش کرتی ہے۔ لوگ لباس سے بے نیاز ہو چکے ہیں لیکن ماسک اتارنے پر تاحال آمادہ نہیں۔ بیماری کا خوف ان کے اندر سرایت کر چکا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ماسک اتارتے ہی انھیں موت آ لے گی۔ آخر کار ایک نوجوان اس خوف سے چھٹکارا پانے میں آزاد ہو جاتا ہے اور دنیا واپس پہلی حالت میں آتی ہے۔ غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ ''پگلی'' معاشرتی قدروں اور انسانی رویوں پر طنز و استہزا کی عمدہ مثال ہے[۲۳]۔ روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض ایک غریب بھکارن کا جسم نوچنے والا معاشرہ وائرس کے خوف سے خود ہی دور بھاگتا ہے اور وہ اس نیرنگیٔ دوراں پر مسکراتی ہے۔ دعا عظیمی کا افسانہ ''محبت نامے لکھنے والی لڑکی'' اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ محبت کا لافانی اور لازوال جذبہ ابتلائے عام میں بھی اپنی لو کو مدھم نہیں ہونے دیتا۔ علاوہ ازیں ''طاعون کے دنوں میں عید'' (رحمٰن عباس)، ''شب غم کا چاند'' (عظیم اللہ ہاشمی)، ''گڈ بائی'' (رومانہ رومی)، ''جوش محبت'' (قمر سلیم)، ''زندہ درگور'' (نورالحسنین)، ''راندۂ درگاہ'' (فرزانہ اسلم روحی)، ''اناج پانی'' (پرویز احمد) اور دیگر افسانے اکیسویں صدی کی عالمگیر وبا کے دوران پیش آنے والے انفرادی و اجتماعی تجربات، انسان کی باطنی کیفیات اور معاشرتی اتار چڑھاؤ کو اپنے اپنے جداگانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

دسمبر ۲۰۱۹ء میں چین کے صوبے ووہان سے پھوٹنے والی وبا اب تک ۲۸ لاکھ سے زائد انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔ مرض کی اذیت سہنے والوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ بڑی معیشتیں تباہی کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی ہیں۔ دنیا بھر میں بے روزگاری کا ایک طوفان ہے جو تھمنے میں نہیں آ رہا اور وبا کے وار ہنوز جاری ہیں۔ وبا اپنے ساتھ بہت سی کہانیاں لے کر آتی ہے: موت اور زندگی کی کہانیاں، خوف اور امید کی کہانیاں۔ کچھ کہانیاں لکھی جاتی اور کچھ ان لکھی رہ جاتی ہیں۔ حقیقت بھی ایک کہانی ہے اور کوئی واقعہ، خبر، واہمہ یا خیال اور خواب بھی ایک کہانی کو جنم دیتا

ہے۔ فکشن کہانی ہوتا ہے لیکن ہر کہانی فکشن نہیں ہوتی۔ فکشن صرف وہ کہانی بنتی ہے جسے آرٹ کی سطح پر پیش کیا جاتا ہے۔ کورونا وبا کے تناظر میں لکھی گئی کچھ کہانیاں فکشن بن سکیں، کچھ صرف کہانی رہ گئیں۔ نیز یہ کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اردو فکشن کا کتنا حصہ وجود کی بھول بھلیوں میں گم ابھی تک جدیدیت کے عہد میں کھڑا ہے اور کتنا نئے امکانات کو ڈھونڈتا ہوا اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

* (پ: ۱۹۷۹ء) ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور۔

۱۔ تھوسی ڈیڈیس[Thucydides]، *The Peloponnesian War*، مترجمہ مارٹن ہیمونڈ [Martin Hammond] (نیو یارک: اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء)، ۹۶-۹۷۔

۲۔ شیخ محی الدین ابن عربی، الفتوحات مکیہ، الجزوالرابع (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۰ھ)، ۱۱۹۔

۳۔ لیوی فراس باربرا [Leavy Frass Barbra]، *To Blight with Plague: Studies in a Literary Theme* (نیو یارک: نیویارک یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۲)، ۴۴۔

۴۔ ابھیک رائے[Abhik Roy]، ''Literature and Pandemics''، مشمولہ روزنامہ *The Statesman* (نئی دہلی: ۳۱ جولائی ۲۰۲۰ء)، ۶۔

۵۔ اورحان پاموک[Orhan Pamuk]، ''وبا کے دن ہمیں کیا سکھاتے ہیں''، مترجم شہلا نقوی، مشمولہ دنیا زاد (وبا نمبر)، شمارہ ۴۹ (کراچی: اکتوبر ۲۰۲۰ء)، ۳۷۔

۶۔ ارون دھتی رائے[Arundhati Roy]، لامحدود انصاف کا الجبرا، مترجم شفیق الرحمان میاں (اسلام آباد: وین گارڈ بکس، ۲۰۰۹ء)، ۲۴۔

۷۔ ناصر عباس نیر، ''وبا: آج کل اور ڈسٹوپیائی فکشن''، ہم سب ڈاٹ کام، ۲۶ مارچ ۲۰۲۰ء، humsub.com.pk/314592/ (۴ مارچ، ۲۰۲۱ء)۔

۸۔ اسد اللہ غالب، ''مکتوب بنام میر مہدی حسین مجروح مکتوبہ جولائی ۱۸۶۱ء''، خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء)، ۱۵۳۔

۹۔ ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح مشمولہ کلیات نذیر احمد (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء)، ۳۔

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۱۰، ۱۱۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۱۵۔

۱۲۔ ایضاً، ۷۴-۷۵۔

۱۳۔ آصف فرخی یکم جون ۲۰۲۰ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے (ان کی وفات کورونا کی وجہ سے نہیں ہوئی)۔ اس شمارے کے پیش لفظ کی مصنفہ غزل آصف کے مطابق مرحوم آصف فرخی اپنی زندگی میں ہی اس شمارے کا مواد ترتیب دے چکے تھے۔ دنیا زاد کا اداریہ آصف فرخی ''محفل'' کے عنوان

سے لکھا کرتے تھے۔ مذکورہ شمارے میں اس عنوان کے نیچے چار صفحات خالی چھوڑے گئے ہیں۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل آصف فرخی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا: ''صحت بھی افسانہ ہے اور مرض بھی، زندگی بھی اور موت بھی۔ شاید بقا بھی افسانہ ہے اور اسی طرح فنا بھی۔ بیماری بجائے خود ایک زندہ حقیقت ہے، اندیشوں سے بھری ہوئی اور ہلاکت خیز۔ ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک جا پہنچی اور لاکھوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسی بیماری سے بڑے پیانے پر خطرہ لاحق ہو رہا ہے کہ لاکھوں انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر افسانہ بنا ڈالے۔ ہم ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگتے ہیں اس مرگِ انبوہ سے پہلے یہ بیماری خود افسانہ بن جائے۔''

دیکھیے: آصف فرخی، ''وبا کے دنوں میں افسانے''، ہم سب ڈاٹ کام، ۱۵ مارچ ۲۰۲۰ء، humsub.com.pk/305242/ (۲۶ مارچ، ۲۰۲۰ء)۔

افسوس کہ وبا کے افسانہ ہونے سے پہلے آصف فرخی کی زندگی ایک افسانہ بن گئی—لوح جہاں پر لکھا ایک ایسا زندہ افسانہ جسے زمانہ بہت جلد مٹا نہیں سکے گا۔ دنیا زاد میں ان کے نام سے چھوڑے گئے خالی صفحات کی بیابانی چار سو رقص کرتی موت کی وحشت کا افسانہ ہے جسے صرف خاموشی کی زبان سمجھنے والے پڑھ سکتے ہیں۔

۱۴۔ نور الہدیٰ شاہ، ''المیہ''، مشمولہ دنیا زاد، شمارہ ۴۹ (کراچی: اکتوبر ۲۰۲۰ء)، ۴۷۔

۱۵۔ آرنلڈ ٹائن بی [Arnold Toynbee]، *Mankind and Mother Earth* (نیو یارک: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۶ء)، ۹۔

۱۶۔ ایضاً، ۱۴، ۵۲۔

۱۷۔ یوال نوح ہراری [Yuval Noah Harari]، ''کورونا وائرس کے بعد کی دنیا''، مترجم سعید نقوی، مشمولہ دنیا زاد (وبا نمبر)، شمارہ ۴۹ (کراچی: اکتوبر ۲۰۲۰ء)، ۱۵-۱۶۔

۱۸۔ ناصر عباس نیر، ایک زمانہ ختم ہوا ہے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۱۱۶۔

۱۹۔ علی تنہا، الٹے رخ کا دریا (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء)، ۱۷۰-۱۷۴۔

۲۰۔ عمار یاسر، ''افسانہ: نووا ہائیٹس''، دیدبان، ۲۸ اکتوبر، ۲۰۲۰ء، https://www.deedbanmagazine.com/blog/fsnh-nww-hy-ytts (۴ اپریل، ۲۰۲۱ء)۔

۲۱۔ خاور چودھری، طلسم کہن (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۰ء)۔

۲۲۔ محمود احمد قاضی، کنواں (گوجرانوالہ: شعبۂ زبان و ادب، اسلامیہ کالج، ۲۰۲۰ء)۔

۲۳۔ غزالہ قمر اعجاز، ''(کرونائی افسانہ) پگلی''، کلچر بُکلیٹ، ۲۰ اکتوبر، ۲۰۲۰ء، https://urdu.culturebooklet.com/Blog/pagli (۱۴ جون، ۲۰۲۱ء)۔

Bibliography

Ahmad, Deputy Nazeer. *Kulyāt-i Nazīr Aḥmad*. Delhi: Kitabi Dunya, 2003.

Chaudhry, Khawar. *Ṯilism-i Kohan*. Faisalabad: Misal Publishers, 2020.

Ejaz, Ghazala Qamar. "(Kōrōnā'i Afsānā) Paglī" Culture Booklet. October 20, 2020. urdu.culturebooklet.com/Blog/pagli. Accessed June 14, 2021.

Farrukhi, Asif. "Vabā kē Dinōṅ mēṅ Afsānē." Humsub. March 15, 2020. humsub.com.pk/305242/. Accessed March 26, 2021.

Ghalib, Asadullah. *Khuṯūṯ-i Ghālib*. Compiled by Ghulam Rasool Mehar. Lahore: Sheikh Ghulam Ali & Sons, 1982.

Hariri, Yuval Noah. "Kōrōnā Vāyras kē Ba'd kī Dunyā." Translated by Saeed Naqvi. *Dunyāẓād* 49. Karachi: October 2020.

Ibn Arabi, Muhyiddin. *Futūḥāt al-Makkiyya*. Beirut: Dar Al Kotob Al-Ilmiyah, 1420 AH.

Leavy, Barbara Fass. To Blight With Plague: Studies in a Literary Theme. New York: New York University Press, 1992.

Nayyar, Nasir Abbas. *Aik Ẓamāna Khatm Huā Hai*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2020.

Nayyar, Nasir Abbas. "Vabā: Āj Kal aur Ḍisṭopīyāī Fikshan." Humsub. March 26, 2020. humsub.com.pk/314592/. Accessed March 4, 2021.

Pamuk, Orhan. "Vabā kē Din Hamēṅ Kiā Sikhātē Haiṅ." Translated by Shehla Naqvi. *Dunyāẓād* 49. Karachi: October 2020.

Qazi, Mehmood Ahmad. *Kuṅvāṅ*. Gujranwala: Department of Language and Literature, Islamia College, 2020.

Roy, Abhik. "Literature and Pandemics." Daily *The Statesmen*. New Delhi: July 31, 2020.

Roy, Arundhati. *Lāmēḥdūd Inṣaf kā Aljabrā*. Translated by Shafiq ur Rahman Mian. Islamabad: Vanguard Books, 2009.

Shah, Noorul Huda. "Almīa." *Dunyāẓād* 49. Karachi: October 2020.

Tanha, Ali. *Ulṭē Rukh kā Daryā.* Lahore: Fiction House, 2020.

Tarar, Mustansar Hussain. *Shehar Khālī, Kūchā Khālī.* Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2020.

Toynbee, Arnold J. *Mankind and Mother Earth*. New York: Oxford University Press, 1976.

Thucydides. The Peloponnesian War. Translated by Martin Hammond. New York: Oxford University Press, 2000.

Yasir, Ammar. "Afsānā Nōvā Hā'iṭs." Deedban. October 28, 2020. deedbanmagazine.com/blog/fsnh-nww-hy-ytts. Accessed April 4, 2021.